جاناں جاناں

احمد فراز

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ اُن زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہُوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہُوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہُوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر

یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے

یہ زخم گلزار بن گئے ہیں

یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے

یہ درد موجِ صبا ہُوا ہے

یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی

یہ پھُول یہ زخم سب ترے ہیں

یہ دُکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے

جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں

جو تیری قربت تری جُدائی

میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنی

وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں

وہ جس کے انداز خسروانہ تھے

اور ادائیں غریب سی تھیں

وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی

خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ

بہت دنوں کا اُجڑ چکا ہے

وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن

کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے

وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ

اُسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

○

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

— ق —

اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہُوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہُوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہُوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہُوئے اوراقِ پریشاں جاناں

○

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلّق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فرازؔ
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

○

اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اُتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فرازؔ
شہرِ ناپرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

خواب مرتے نہیں

خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو

ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے

جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خواب مرتے نہیں

خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں

جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

ظلم کے دوزخوں سے بھی پھکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں

خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سُقراط ہیں
خواب منصُور ہیں

لینن گراڈ
۱۹۶۷

○

یوں تو پہلے بھی ہوئے اُس سے کئی بار جُدا

لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں

کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دُور تو یوں لگتا ہے

جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جُدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی

"میں جُدا گریہ کناں، ابر جُدا، یار جُدا"

کج کلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوقِ گردن سے نہیں طرۂ دستار جدا

اس قدر روپ ہیں یاروں کے کہ خوف آتا ہے
سرِ میخانہ جدا اور سرِ دربار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جدا

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا

○

جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انھیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

اور اس نے

مرے ساغر میں

مئے سرخ انڈیلی —— تو کہا

مت سوچو!

تم یہاں آئے ہو

اس ملک کے

اس شہر کے

اس جلوۂ تسکیں میں جہاں

سب کے سب رقص کناں

نغمۂ طلب

مست ادا مت سوچو

جاگتی رات

کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا

مت سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو

پردیس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمارِ شب و روز و دلِ افگار

عزیزانِ وطن کی یادیں

اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبوں کو تو خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتی

یہ جو زنگار ہیں غربت کے

خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

آستینیں جنبوں کی ہیں

اس طرح سنبھالے ہوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمھارے دل و جاں ہوں

اس گھڑی تم ہو جہاں

مملکت خواب نہیں

یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں

زندگی مے کی طرح

شوخ ہے طرّار نہیں

زہراب نہیں

اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری

اس جگہ شاملِ آداب نہیں

مت سوچو!

پیرس

۱۹۷۴

○

سُنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے

سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ

وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن

ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہِ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے

ابھی ہجومِ سرِ رہگزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل

وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فراز اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی

ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے

کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو

آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نجانے

کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے

جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی

اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد

شاید کہ تمھارا قد و قامت نکل آئے

اب کس کا جشن مناتے ہو!

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہُوا
اب کس کا گیت سُناتے ہو
اُس تن من کا جو دو نیم ہُوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ

اِن آنکھوں کی تقدیر ہُوا

اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے

گلیوں میں بے توقیر ہُوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت

بازاروں میں نیلام ہُوئی

اُس مٹی کا جس کی حرمت

منسوب عدو کے نام ہُوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے

اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں

اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا

اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بد قسمت تھا

راہوں میں بہایا تن میں رہا

اُس پھول کا جو بے قیمت تھا

آنگن میں کھلایا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے

نیزے کی انی مرہم سمجھا

اُس مغرب کا جس کو تم نے

جتنا بھی لُوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو

سے تم نے فروزاں راتیں کیں

یا اُن مظلوموں کا جن سے

خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عفّت
لُٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسے کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غمخواروں میں

اُن نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے
ایسے جلّاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سرِ بازار کریں
یا اُن ظالم قزّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہُوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دُکھ کا نشانہ ہُوئے

اُس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمھارے حصّے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھا ہے اِس قصّے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لیے
اُس جشن میں مَیں بھی شامل ہوں
نوحوں سے بھرا کشکول لیے

○

ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہدِ وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترک محبّت کرے کرے

اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سُن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہلِ شہر کے سائے سے دُور دُور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گُل بن کے پھُوٹتا ہے لہو نوکِ خار سے
زخمِ رگِ بہار رہیں پتّے ہرے ہرے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فراز
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

○

شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گُلِ حباب ہیں سر میں ہَوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گُل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر ردا بہار کی ہے

کوئی تو لالۂ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاکِ جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہَوا بہار کی ہے

شمارِ زخم ابھی سے فراز کیا کرنا
ابھی تو جان مری اِبتدا بہار کی ہے

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجا لی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحفِ رُخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وہ مروّت سے مِلا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فرازؔ
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

○

کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اُس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ قرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اُس سے

یہ اہلِ بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانۂ دل ابتدا کرو اُس سے

یہ کیا کہ تم ہی غمِ ہجر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سُنا کرو اُس سے

فرازؔ ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا!
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اُس سے

○

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اُسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہُوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اُسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کا ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

○

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تُو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدّر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تُو بھی دل کو اِک لہو کی بُوند سمجھا ہے فراز
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سُورج

سحر کے سُورج

میں رو رہا ہوں

کہ میرا مشرق لہو لہو ہے

وہ میرا مشرق

جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے

جو میرے اطراف کا نشاں

میری آبرو ہے

لہو لہو ہے

سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہُوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاؤں کا نُور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں

یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں

اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں

میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

سحر کے سورج

ستم کی آندھی رُکے

تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا

سسک سکوں گا

لہو کی بارش تھمے

تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا

ابھی تو میں جانکنی کے دُہرے عذاب میں ہوں

جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں

کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج

مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں

جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے قدم جمائے

جو منتظر تھے

کہ رزم گاہِ طلب بلائے

جو آزمائش کی ہر گھڑی میں

یقین کی مشعلیں جلائے

وطن کی ناموس کے لیے

بے شمار بازو علَم اُٹھائے

رواں ہوئے تھے یہ عہد کر کے

کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں

مگر وفا پر نہ حرف آئے

سحر کے سورج

مری نظر میں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں

کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ

کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں

جو پا بزنجیر
منفعل گردنیں جھکائے

عدو کے نرغے میں

ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں

جہاں حقارت کے طعن

نفرت کے سنگ

رسوائیوں کے بازار

منتظر ہیں

سحر کے سورج

یہ میں نہ دیکھوں
یہ تو نہ دیکھے

یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چھپتا لہو نہ دیکھے

یہ میں نہ دیکھوں   یہ تو نہ دیکھے

○

ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے بُرا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو ناخدا کہتے
بھلا ہُوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سُنایا اُسے فسانہ لگا

برونِ در نہ کوئی روشنی نہ سایا تھا
سبھی فساد مجھے اندرونِ خانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت پے بہ پے اُڑان لگے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

ستم کے عہد میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہو فراز مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں اک زمانہ لگا

○

آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو

اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے

لازم نہیں کہ تو بھی مرا ہم خیال ہو

خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا

تیری جبیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو

پھر تُو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات

وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر

ایسا سلوک کر کہ مرے حسبِ حال ہو

ٹوٹا تو ہُوں مگر ابھی بکھرا نہیں فراز

میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو

○

برسوں کے بعد دیکھا "اک شخص دلربا سا"
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا

خوابوں میں خواب اُس کے یادوں میں یاد اُس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اِک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فراز کا سا